HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

پاکستانی ادب کی شناخت اور جدیدیت کا رجحان

IDENTITY OF PAKISTANI LITERATURE AND TREND OF MODERNITY

*محمد طارق

**ڈاکٹر مظفر عباس

ABSTRACT

The word Modernity is a convoluted term. A distraction was seen at community, political and literary level also in an early age of Pakistan.The stagnation atmosphere was spread on literature also.A famous critic Hasan Askari indicates that situation for writing an article titled "Urdu Adab ki Maut".This article highlights the Effects of Modernity on Urdu literature in perspective of Pakistani literature.

کلیدی الفاظ:

جدیدیت، محمد حسن عسکری، ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق، پاکستانی ادب کی تحریک، اسلامی ادب، رشید امجد، مسلم تشخص

اُردو ادب میں جدیدیت کا رُجحان ساٹھ کی دہائی میں منظرِ عام پر آیا۔ لفظ "جدیدیت" بذاتِ خود ایک گنجلک اصطلاح ہے۔ ہر دور اپنے سے پہلے کے مقابلے میں جدیدیت کا حامل ہوتا ہے۔ نیا دور کسی نہ کسی حوالے سے، کسی نہ کسی زاویے سے، کسی نہ کسی رنگ سے پرانے دور سے مختلف خصوصیات رکھتا ہے۔ جدیدیت کا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موجودہ دور کے حوالے سے کیا بیان کرتا ہے اور دورِ حاضر کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ رائے:

> "جدیدیت ہر اُس دور میں اُبھرتی ہے جو علمی انکشافات کے اعتبار سے ہنگامہ خیز اور روایات و رسوم کی جکڑ بندیوں کے باعث رجعت پسند ہوتا ہے۔ کسی بھی زمانے میں اہلِ فن کی مشترکہ کوششیں جو اِجتہاد اور تخلیقی برانگیختگی اور احساسِ کرب سے عبارت ہوتی ہیں، جدیدیت کا نام پاتی ہیں۔"(۱)۔

اس جدیدیت کا پس منظر کچھ اس طرح سے ہے کہ قیامِ پاکستان کا ابتدائی دور ادبی، سیاسی اور معاشرتی سطح پر خلفشار کا شکار تھا۔ سیاسی ڈھانچہ مکمل طور پر شکست و ریخت کا شکار ہو چکا تھا۔ معاشرہ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور ایک نیا معاشرہ تشکیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔ ادب میں بھی پرانے موضوعات اپنی افادیت کھو چکے تھے۔ ایک نئے ملک کے تقاضے اور تھے اور ایک نیا ملک ایک مختلف تصویر پیش کر رہا تھا۔ جہاں ہجرت کا کرب، رشتوں کے تقدس کی پامالی، اَخلاقی اقدار کا زوال، مذہبی منافرت، معاشی بدحالی اور سماجی انتشار موجود تھا۔ اس معاشرے میں رویے بدل چکے تھے اور لوگوں میں محبت کی جگہ نفرت اور اِجتماعیت کی جگہ اِنفرادیت نے لے لی تھی۔ اجتماعی مفاد کی جگہ ذاتی مفاد پیشِ نظر تھا۔

ایسے حالات میں ایک متوازن ادب کیسے لکھا جا سکتا تھا۔ ۷۴۹۱ء کے بعد ترقی پسند تحریک زوال کا شکار ہوئی اور ۳۵۹۱ء میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے اس پر مکمل طور پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس سے ترقی پسند تحریک کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس تحریک سے وابستہ لوگوں کو یا تو نظر بند کر دیا گیا یا پھر یہ لوگ خود ہی منظر سے ہٹ گئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ساری مزاحمت ختم ہو کر رہ گئی۔ حلقہ اربابِ ذوق جو ترقی پسند تحریک کے شانہ بشانہ مخالف سمت میں رواں دواں تھا، وہ بھی اس تحریک کے زوال پذیر ہونے کی وجہ سے اپنا اثر قائم نہ رکھ سکا اور پھر بعد میں گروہ بندیوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔

---

*ریسرچ سکالر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی ایجوکیشن، لاہور

**پروفیسر "ریٹائرڈ"، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

ان حالات میں اَدب پر بالکل خاموشی چھا گئی کیوں کہ فسادات کے علاوہ شاید کوئی موضوع ایسا نہیں تھا کہ جو جاندار ہو اور اُدباء کی توجہ حاصل کر سکے۔ ایک ہی جیسے موضوع پر مختلف ادیبوں نے لکھا لیکن بحیثیت مجموعی اس دور میں لکھے جانے والے ادب کے اثرات سوائے فسادات کے حوالے سے کچھ زیادہ دیرپا نہیں تھے۔ ادب میں اسی جمود کی فضا کی نشاندہی نقاد محمد حسن عسکری اپنے مضمون ''اُردو ادب کی موت'' میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''پتہ نہیں اُردو ادب کی موت کے اعلان سے لوگ کیوں ہچکچا رہے ہیں، کیوں کہ اب تو معاملہ جمود اور انحطاط سے بھی آگے پہنچ چکا۔ اگر صاف اردو ادب کی موت کا اقرار کر لیا جائے تو کم سے کم اتنا فائدہ ہو سکتا ہے کہ سال دو سال چپ رہنے کے بعد ہمارے ادیبوں میں دوبارہ جان آ جائے، یا اس دوران میں کچھ نئے ادیب پیدا ہو جائیں۔۔۔ ادب کا تابوت سر پر اٹھائے پھرنے سے کیا فائدہ؟ اب تو اُسے دفنا ہی دینا اچھا ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔''(۲)۔

نثر کے حوالے سے افسانے میں جمود کی یہ فضا اُن اُدباء کی عدم دلچسپی سے بھی سامنے آئی کہ جنہوں نے ہجرت تو کر لی تھی لیکن اس ہجرت پر لکھنے کے لیے اپنے ذہن کو وہ آمادہ نہ کر سکے تھے۔ ان میں سے چند اگر لکھنا بھی چاہتے تھے تو نئے موضوع پر لکھنے کے لیے تیار نہیں تھے اور ماضی کو اپنا سب کچھ سمجھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ملاحظہ فرمائیں اس سلسلے پروفیسر وقار عظیم کی یہ رائے:

''ان افسانہ نگاروں میں سے اکثر نے موضوعات کی تلاش میں اپنے گرد وپیش کی زندگی کے واقعات اور اس کے مسائل کو اپنانے کی بجائے اسی ماحول کو اپنی کہانیوں کا پس منظر بنایا جو مدتوں سے ان کی نظر میں بسا ہوا ہے۔۔۔ موضوع سے ہٹ کر اُسلوب اور فن کے نقطہ ء نظر سے بھی ان افسانہ نگاروں میں سے کسی کے یہاں کسی نئے جادہ اور منزل کا نشان نہیں ملتا۔''(۳)۔

اسی شکست وریخت کے مادے سے ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کا پودا بھی اُبھر کر آ گیا۔ ایوب خان کا یہ مارشل لاء ایک نئے ملک اور معاشرے کے لیے پہلا تحفہ تھا یا دوسرے لفظوں میں یہ پہلا قدم تھا کہ اس کے بعد تو پھر یہ قدم اٹھتے ہی چلے گئے اور ملکِ پاکستان کو داغدار کر گئے۔ مارشل لاء سے جہاں سیاسی سطح پر تبدیلی آئی، وہیں ادبی سطح پر بھی بہت سی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ادیبوں کی آواز کو دبا کر رکھ دیا گیا۔ وہ جو پہلے ہی کچھ لکھنے کے لیے تیار نہیں تھے اور فضا پہلے ہی گھٹن کا شکار تھی، اب تو بالکل ہی بدل کر رہ گئی۔ معاشرہ بے جا پابندیوں میں جکڑ کر رہ گیا۔ ملاحظہ ہو اس سلسلے ڈاکٹر رشید امجد کی یہ رائے:

''تمام اشیاء وقتاً فوقتاً سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی انقلابات کے زیرِ اثر اپنا مفہوم بدلتی رہتی ہیں۔ ادب بھی ان تبدیلیوں میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہوتے ہوئے پرانی روایتوں کو نیا موڑ دیتے ہوئے نیا چہرہ بناتا ہے۔''(۴)۔

سعادت حسن منٹو ایک روایت کا نام تھا، ایک روایت کا تسلسل تھا۔ منٹو کی یہ روایت حقیقت نگاری پر مبنی تھی۔ منٹو نے اصل میں حقیقت نگاری سے زیادہ واقعیت نگاری سے کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کی ۱۹۵۵ء میں وفات کے ساتھ ہی یہ روایت بھی ختم ہو گئی۔ حالانکہ منٹو کی وفات سے پہلے ہی حسن عسکری نے ستمبر ۱۹۵۳ء میں اپنے مضمون ''اردو ادب کی موت'' کے عنوان سے کالم لکھ کر اس صورتحال کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی جو ادب میں پیدا ہو چکی تھی اور جسے دور کرنے کے لیے ادیبوں کی توجہ اس طرف دلائی گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انتظار حسین نے جو خود بھی حسن عسکری سے بہت متاثر تھے، اُن کی مخالفت میں ایک کالم لکھا جس کا عنوان تھا ''اُردو ادب کی موت کے بارے میں''۔ اپنے اس مضمون میں انتظار حسین نے نئی نسل کے بارے میں قیاس آرائیاں لگانے کے قیاس کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''اس وقت آپ گنتی صرف پرانی نسل کی گن سکتے ہیں۔ نئی نسل گنتی کی مدد سے نہیں سمجھی جا سکتی۔ اسے سمجھنے کے لیے اس مزاج کا پتہ چلانا پڑے گا جو پرانی نسل سے اپنا الگ رنگ رکھتا ہے۔ نئی نسل کی بنی بنائی شکل نہیں ہے کہ اس کی طرف اشارہ کر کے بتایا جائے کہ صاحب دیکھ لیجیے وہ رہی نئی نسل، اس کی شکل بن رہی ہے۔''(۵)۔

انتظار حسین کا کہنا بھی کسی حد تک درست تھا کہ ہر نسل اپنا راستہ خود تلاش کرتی ہے یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے پانی خود اپنی پنسال میں آ جاتا ہے، جس طرح ادب خود اپنا مقام بناتا ہے، اسی طرح نئی نسل بھی پرانی نسل سے بالکل جدا سوچ کی مالک ہوتی ہے۔ اسے زبردستی روایات کا اسیر نہیں بنایا جا سکتا۔ ویسے بھی پرانی نسل کے لیے جو فائدہ مند ہے اور اس کی نظر میں جو اہم ہے، ہو سکتا ہے کہ نئے حالات و واقعات کی رُو سے نئی نسل کے لیے وہی چیز غیر اہم ہو۔ ادب میں ساٹھ ۶۰ء کی دہائی میں جن مباحث نے سر اٹھایا وہ سب سے پہلے نظم میں سامنے آئے۔ نظم میں ہی ان نئے مباحث کی ابتداء ہوئی۔ اس دہائی میں جن مباحث نے سر اٹھایا اُن میں ''نئی لسّانی تشکیلات'' کے مباحث سرفہرست ہیں۔ ان مباحث کے سُرخیل میں جیلانی کامران، افتخار جالب اور ڈاکٹر وزیر

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

آغا کا نامِ نامی آتا ہے۔ جیلانی کامران کی شعری تصنیف "استانزے"، افتخار جالب کی "ماخذ" اور ڈاکٹر وزیر آغا کی "شام اور سائے" کے دیباچے اس بات کے غماز تھے کہ نئے مباحث وقت کی ضرورت ہیں۔ ان دیباچوں میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اب نئی لفظیات پر غور و فکر کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں افتخار جالب بھی یہی کہتے تھے کہ لسّانی تشکیلات اساسی طور پر شعر و ادب کی نیابت کرتی ہیں۔ مواد کو ہیئت میں دیکھنا ایک رائج الوقت الحاقی معاونوں سے نجات ہی نہیں دلاتا بلکہ اس جوہرِ خاص کو بلاشرکت غیرے ممیز کرتا ہے جس کی منزہ شکل و صورت کی پہچان از خود مسلک کی حیثیت رکھتی ہے۔

نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی جدیدیت کے اثرات محسوس کیے گئے۔ جدیدیت سے نثر میں افسانے میں بہت سی مختلف نوعیت کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں تکنیک کے ساتھ ساتھ ہیئت میں بھی دَر آئیں۔ اس کے علاوہ انسان کا اُسلوب بھی بالکل ہی بدل کر رہ گیا۔ جدید افسانے کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ رائے:

"جدید اُردو افسانے نے کردار کی معروضیت کو خیر باد کہہ کر فقط بے جسم ہیولوں تک خود کو محدود کر لیا اور یوں کہانی کے سارے خدوخال آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ یوں بھی جب افسانے سے کردار ہی غائب ہو یا افسانہ معروضیت سے ایک بڑی حد تک محروم ہو جائے تو پھر ہیولے اور سائے جنم لیتے ہیں اور انتشار کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔"(۶)۔

جدید افسانہ میں پلاٹ کو اتنا عمل دخل حاصل نہیں تھا جتنا پرانے دور کے افسانوں میں تھا۔ پرانے دور میں پلاٹ کے بغیر افسانے کا تصور بھی نہیں تھا لیکن جدیدیت نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ پلاٹ اور کہانی کے فرق کو حسن عسکری نے کچھ یوں ظاہر کیا:

"عام طور پر لوگوں کے ذہن میں کہانی اور پلاٹ کا فرق نہیں ہوتا۔ ماجرا سے مراد صرف وہ واقعات ہیں جو کہیں پیش آئے لیکن یہ چیز کہانی ہے۔ یہ پلاٹ نہیں۔۔۔ کہانی کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز ہونی چاہیے جب جا کے پلاٹ بنتا ہے۔"(۷)۔

معاونوں سے نجات ہی نہیں دلاتا بلکہ اس جوہرِ خاص کو بلاشرکت غیرے ممیز کرتا ہے جس کی منزہ شکل و صورت کی پہچان از خود مسلک کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی جدیدیت کے اثرات محسوس کیے گئے۔ جدیدیت سے نثر میں افسانے میں بہت سی مختلف نوعیت کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں تکنیک کے ساتھ ساتھ ہیئت میں بھی دَر آئیں۔ اس کے علاوہ انسان کا اُسلوب بھی بالکل ہی بدل کر رہ گیا۔ جدید افسانے کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ رائے:

"جدید اُردو افسانے نے کردار کی معروضیت کو خیر باد کہہ کر فقط بے جسم ہیولوں تک خود کو محدود کر لیا اور یوں کہانی کے سارے خدوخال آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ یوں بھی جب افسانے سے کردار ہی غائب ہو یا افسانہ معروضیت سے ایک بڑی حد تک محروم ہو جائے تو پھر ہیولے اور سائے جنم لیتے ہیں اور انتشار کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔"(۶)۔

جدید افسانہ میں پلاٹ کو اتنا عمل دخل حاصل نہیں تھا جتنا پرانے دور کے افسانوں میں تھا۔ پرانے دور میں پلاٹ کے بغیر افسانے کا تصور بھی نہیں تھا لیکن جدیدیت نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ پلاٹ اور کہانی کے فرق کو حسن عسکری نے کچھ یوں ظاہر کیا:

"عام طور پر لوگوں کے ذہن میں کہانی اور پلاٹ کا فرق نہیں ہوتا۔ ماجرا سے مراد صرف وہ واقعات ہیں جو کہیں پیش آئے لیکن یہ چیز کہانی ہے۔ یہ پلاٹ نہیں۔۔۔ کہانی کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز ہونی چاہیے جب جا کے پلاٹ بنتا ہے۔"(۷)۔

روایت سے جڑے افسانے میں پلاٹ اور کہانی کا عنصر لازمی جزو تصور کیا جاتا تھا۔ واقعات میں ایک تسلسل پایا جاتا تھا لیکن جدیدیت کے آتے ہی پلاٹ کی اہمیت نہ رہی لیکن کہانی کہیں نہ کہیں ضروری تھی۔ ملاحظہ فرمائیں ایک انٹرویو میں رشید امجد کی یہ رائے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

> ”افسانے میں، چاہے وہ نیا ہو یا پرانا، کہانی پن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اختلاف دراصل کہانی پن کی تعریف کا ہے۔ ہمارے پرانے افسانہ نگار واقعات کے تسلسل یا اجتماع کو کہانی کہتے تھے۔ ہم خیال کی اکائی کو بھی، اگر اس میں ترتیب قائم ہے کہانی سمجھتے ہیں۔ خیال وقوعہ ہی سے جنم لیتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وقوعہ ٹھوس سطح پر رہ جاتا ہے، جبکہ خیال اوپر اٹھ کر ایک ارفع شکل اختیار کر لیتا ہے۔“(۸)۔

نثر میں بالعموم اور اُردو افسانے میں بالخصوص پاکستانی ادب کی تحریک کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اُردو افسانے میں یہ اثرات پاکستانی ماحول میں نظر آتے ہیں۔ یہ اثرات پاکستانی معاشرے میں پائے جانے والے جذبات کی صورت میں بھی عیاں ہوتے ہیں، یہ اثرات ایک دوسرے کے بارے میں احساسات کی شکل میں بھی موجود ہیں، یہ اثرات افراد کے مابین رشتوں میں فکر کے حوالے سے، یہ اثرات ایک دوسرے کے لیے پائے جانے والے رویوں کی صورت میں، یہ اثرات پاکستانی تشخص کے حوالے سے، یہ اثرات تاریخ کے حوالے سے، یہ اثرات بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے حوالے سے، یہ اثرات ادب میں بدلتے ہوئے رجحانات کے حوالے سے پائے جاتے ہیں۔ یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ادب میں جو بھی تحریک پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی سطح پر ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ اگر فوراً نہیں تو بعد میں ہی لیکن وہ تحریکیں اپنے اثرات ضرور چھوڑ جاتی ہیں۔ اگر اسلامی نقطہء نظر سے دیکھا جائے تو مسلم تشخص اور مسلم ثقافت، اسلامی تہذیب و تمدن کے کہیں نہ کہیں آثار ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی تحریک پیدا ہوتی ہے تو اس کی مخالفت اور حق میں دلائل دینے والوں کی رائے بھی مقدم ہوتی ہے۔ ہر دو افراد کے مابین مقابلہ بازی کا یہ رجحان ادب میں مثبت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کبھی کوئی تحریک اپنے دور میں چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر پروان نہیں چڑھتی ہے اور وقتی طور پر دب کر رہ جاتی ہے، عوامل خواہ کوئی بھی ہوں لیکن یہ بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ یہ کبھی کبھی کسی اور تحریک کے لیے بنیاد فراہم کرنے کا کام کرتی ہے اور کبھی کسی اور دور میں جنم لینے والی کسی اور تحریک کے لیے مشعل کا کام کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مستقبل کی کوئی بھی تحریک کسی نہ کسی شکل میں ماضی میں پیدا ہونے والی تحریک سے جڑی ہوتی ہے یا تو اسی تحریک کی ایک کڑی ہوتی ہے یا پھر اس تحریک کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر شفیق انجم کی یہ رائے:

> ”یہ ایک حقیقت ہے کہ تحریکیں کبھی مرتی نہیں بلکہ اپنا معنوی قالب بدل لیتی ہیں اور مدتوں ان کے آثار باقی رہتے ہیں۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد جب ہنگامی حالات کی گرد بیٹھی تو ان تحریکوں کی معنویت بھی ایک نئے انداز سے سامنے آنے لگی۔ ساٹھ کی دہائی اور اس کے بعد اگرچہ اردو افسانے میں جدیدیت کا رجحان غالب رہا اور موجود حالات و ماحول کے مطابق افسانے کے قالب میں تبدیلی آئی لیکن ماضی قریب کی ان تحریکوں کے زندہ معنوی عناصر سے بھی استفادہ کیا گیا۔“(۹)۔

ماضی میں پیدا ہونے والی ادبی تحریکوں میں سے زیادہ تر ایک دوسری کے خلاف ردعمل کے طور پر پیدا ہوئیں۔ مثال کے طور پر انیسویں صدی کے آخری رُبع میں سرسید کی عقلیت پسندی تحریک کے جواب میں رُومانوی تحریک نے جنم لیا اور اصلاح پر مبنی تحریک چل رہی تھی۔ یہ رومانوی تحریک بیسویں صدی کے پہلے رُبع تک کسی نہ کسی شکل میں ادب میں موجود رہی گو کہ اس کے ساتھ ساتھ افسانے میں پریم چند کی شکل میں مثالیت پسندی کی تحریک بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ بیسویں صدی کے دوسرے رُبع میں رومانیت کا ردعمل ترقی پسند تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ حقیقت نگاری کی بہت بڑی تحریک تھی جس میں سماج میں پیدا ہونے والی برائیوں اور خامیوں کو حقیقت نگاری کے پردے میں حل کیے جانے پر زور دیا گیا۔

ترقی پسند تحریک کا نصب العین ”ادب برائے زندگی“ کے گرد گھومتا تھا پھر اسی تحریک کا اثر پچاس کی دہائی تک آتے آتے اپنی افادیت تقریباً کھو بیٹھا تھا اور اس کے ردعمل کے طور پر ایک اور تحریک ادب میں وجود میں آئی اور وہ تھی ”حلقہ اربابِ ذوق“ کی تحریک جو ”ادب برائے ادب“ کا نعرہ لگاتی ہوئی آسمانِ ادب پر طلوع ہوئی۔ پچاس ۵۰ء کی دہائی میں ہی ایک نئے وطن، نئی سرزمین اور ایک دنیا کے نقشے، ایک نئے ملک کے وجود میں آتے ہی ادبی حلقوں میں ایک نیا مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ اب اس نئی سرزمین کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ادب لکھا جائے اور یہ مطالبہ شدت اختیار کرتے ہوئے پاکستانی ادب کی تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ زمینی حقائق کا ادراک اور نئے وطن کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ادب ہی اس ملک اور مٹی اور اس ملک میں رہنے والے افراد کی آرزوؤں اور امنگوں کا صحیح ترجمان کہلانے کا حقدار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اسی تحریک کا دوسرا سِرا ساٹھ ۶۰ء کی دہائی میں جدیدیت کہلایا کہ جس میں پرانی روایات سے بغاوت کا عنصر شامل تھا اور ملک میں مارشل لاء کی صورت میں علامت نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ پھر علامت کے ساتھ ساتھ تجریدیت نے بھی اپنی جگہ بنالی۔ اس سلسلے میں اعجاز راہی اپنے مضمون ”نئے افسانے کے بارے میں چند سوال“ میں لکھتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

"علامتی افسانہ جس نے زمانے کی کروٹ سے جنم لیتے ہوئے نئے انسانی جذبات کیساتھ جنم لیا آج ایک سایہ دار درخت کی طرح ادب میں پھیل رہاہے۔اس نے زندگی، سماج اور دنیا بھر کے مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔"(۱۰)۔

یہ تحریک ساٹھ ۶۰ءسے ستّر ۷۰ء کی دہائی تک رہی کہ اسی میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ارضی تحریک کا ڈول بھی ڈالا گیا۔ملک میں یحیٰی دور اور پھر بھٹو کی پھانسی کے بعد ضیاء الحق کے مارشل لاء سے مزاحمتی ادب کی تحریک شروع ہوئی۔اصل میں یہ مزاحمت ایوب دور کے مارشل لاء میں اتنی زیادہ نہ تھی لیکن ضیاء الحق کے دور میں تو اس مزاحمتی تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ شاعروں اور ادیبوں کو بھی جیلوں میں ڈال دیا گیا اور کوڑے بھی مارے گئے۔اس دور میں جبر اور گھٹن کے خلاف ادبی مزاحمت کا رجحان پایا گیا۔اعجاز راہی کا مرتب کردہ افسانوی مجموعہ "گواہی" اسی مزاحمتی ادب کی نشانی تھا جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا اور اس میں کل پندرہ افسانے شامل تھے۔"گواہی" کے پہلے صفحے پر حضرت علیؓ کا یہ قول درج تھا:

"میں نے اس وقت اپنے فرائض انجام دیے جب دوسرے اس راہ میں قدم اٹھانے کی جرات نہیں رکھتے تھے اور اس وقت سر اٹھا کر سامنے آیا جب دوسرے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے۔اس وقت زبان کھولی جب سب گنگ نظر آئے، گو میری آواز سب سے دھیمی تھی مگر سبقت و پیش قدمی میں سب سے آگے۔"(۱۱)۔

مزاحمتی ادب کی اس تحریک کے اثرات اردو ادب پر بھی نمایاں ہوئے اور اس طرح سے یہ مزاحمتی ادب کی تحریک شاعری میں بھی دَر آئی۔نثری ادب میں تبدیلیوں کے اثرات کے ساتھ ساتھ شعری ادب میں بھی بہت سی انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ملاحظہ فرمائیں اس سلسلے میں ڈاکٹر رشید امجد کی یہ رائے:

"زبان کے ورتارے، فارسی اثرات سے دور ہو کر اردو کے خالص پاکستانی رنگ اور لغت میں نئے الفاظ کی شمولیت، جذبات واحساسات کے اظہار میں عقیدے کے پہلو اور مجموعی فضا کے اثر نے پاکستانی ادب کو ایک الگ تشخص عطا کیا ہے۔یہ علیحدہ تشخص، مزاج اور ذائقہ ہی پاکستانی ادب کو اردو زبان میں لکھے جانے والی دوسری تخلیقات سے الگ کرتا ہے۔اسی طرح جیسے انگریزی زبان میں لکھے جانے والے افریقن ادب، امریکن ادب اور برطانوی ادب کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔"(۱۲)۔

ڈاکٹر رشید امجد مزید لکھتے ہیں کہ پاکستانی اردو کا اپنا ایک مزاج اور لہجہ وجود میں آ چکا ہے۔یہ مزاج ذخیرہ الفاظ، تلفظ، لہجے اور زبان کی نئی تہذیبی روایت کی وجہ سے بھارتی اردو کے مزاج اور لہجے سے قطعی مختلف ہے۔ہماری اردو نے پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو سے جو اثرات قبول کیے ہیں۔انہوں نے ایک نئے لہجے کو جنم دیا ہے جو خالصتاً پاکستانی لہجہ ہے چنانچہ اس زبان میں لکھا جانے والا ادب لسانی حوالوں سے الگ پہچان رکھتا ہے۔سیاسی سماجی مسائل کی جو صورتیں ہمیں تیسری دنیا کے ممالک سے جوڑتی ہیں اور الگ بھی کرتی ہیں ان کے اثرات بھی ہمارے ادب پر پڑے ہیں اور موضوعاتی طور پر ان سے ایک شناخت قائم ہوئی ہے۔پاکستانی ادب میں سیاسی مزاج کی داخلیت کے بارے میں کوئی دو رائے نہیں ہیں۔ظاہر ہے اس سے موضوعات بھی اپنے اندر وہ وُسعت پیدا نہ کر سکے جو فی زمانہ درکار تھی۔لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے اس نے اپنی شناخت ضرور بنالی ہے۔اس سلسلے میں احمد جاوید اپنے مضمون "پاکستانی ادب کی شناخت" میں لکھتے ہیں:

"جب ہم پاکستانی ادب کا موازنہ بھارت کے اردو ادب سے کرتے ہیں تو الگ سے صاف پہچانے جاتے ہیں۔اس کا نقصان یہ ضرور ہوا ہے کہ ہمارے موضوعات میں وہ وسعت نہیں آئی جو جمہوری معاشروں میں ممکن ہوتی ہے اور جو بھارت کے اردو ادب میں بھی دکھائی دیتی ہے لیکن تکنیکی، تخلیقی اور ہیئتی سطح پر ہمارا ادب کہیں آگے دکھائی دیتا ہے۔اس کی شناخت بھارتی ادب پر اس کے اثرات سے صاف ظاہر ہے۔"(۱۳)۔

چند عناصر اس بات کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں کہ اسلامی ادب کی تحریک اور پاکستانی ادب کی تحریک کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔حالانکہ ہر تحریک کسی آنے والی تحریک کی بنیاد اور کسی پرانی تحریک پر اپنی عمارت کھڑی کرتی ہے۔ادب جمود کا شکار نہیں ہوتا۔اس لیے ادبی تحریکیں پیدا ہوتی رہی ہیں، پیدا ہوتی رہتی ہیں اور پیدا ہوتی رہیں گی۔نئے نئے زاویے، نئے وژن (vision) سامنے آتے رہتے ہیں۔اس سلسلے میں ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر شفیق انجم کی یہ رائے:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 6 No.2 2022

"بحیثیت مجموعی تحریکِ ادبِ اسلامی اور پاکستانی ادب کی تحریک کا اُردو افسانے پر اثر ایک نئے ویژن کے حوالے سے ہے۔ یہ نیا ویژن ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت سے ہم آہنگ ہو کر سامنے آیا اور پاکستانی افسانے اور ادب کا الگ تشخص جو کہ ان تحریکوں کا مطمع نظر تھا، رفتہ رفتہ ایک واضح شکل اختیار کر گیا۔"(۱۴)۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، نئے مقالات۔ سر گودھا: مکتبہ اُردو زبان، ۱۹۷۲ء، ص ۱۴

۲۔ محمد حسن عسکری، عسکری نامہ (افسانے، مضامین)۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۴۹۸

۳۔ پروفیسر وقار عظیم، داستان سے افسانے تک۔ سندھ: اُردو اکیڈمی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۲

۴۔ ڈاکٹر رشید امجد، علی فاروق (مرتبین)، پاکستانی ادب (جلد پنجم)۔ راولپنڈی: ایف۔ جی سر سید کالج، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹

۵۔ انتظار حسین، اُردو ادب کی موت کے بارے میں (مضمون) مشمولہ ساقی (سالنامہ) جنوری ۱۹۵۴ء،

۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، نئے مقالات۔ سر گودھا: مکتبہ اُردو زبان، ۱۹۷۲ء، ص ۱۷۶

۷۔ محمد سہیل عمر (مرتب)، تخلیقی عمل اور اُسلوب۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۶۳

۸۔ مناظر عاشق ہر گانوی، رشید امجد سے ایک انٹرویو مطبوعہ 'اوراق' اگست، ۱۹۹۰ء، ص ۸۵

۹۔ ڈاکٹر شفیق انجم، اُردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۳۳

۱۰۔ ڈاکٹر نوازش علی، پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال۔ راولپنڈی: گندھارا بکس، ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۷

۱۱۔ ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص ۷۶

۱۲۔ ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶

۱۳۔ احمد جاوید، پاکستانی ادب کی شناخت (مضمون) مشمولہ پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سالمرتبہ ڈاکٹر نوازش علی۔ راولپنڈی: گندھارا بکس، ۲۰۰۵ء، ص ۳۸

۱۴۔ ڈاکٹر شفیق انجم، اُردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص ۳۳۲